شبانہ، زینی اور جاوید سکول سے آجائیں گے اور پھر ـــ پھر خدا جانے کیا ہو؟

اس نے سعیدہ کے گھر کا نمبر ملایا اور جی ہی جی میں دعا مانگی کہ کاش سعیدہ چونکا اٹھا کر کہے:

"جینا لولو بر جیڈا میرے بھائی تو کل چلے گئے رسالپور"۔

جب دوسری طرف سے آواز آئی تو فون زارا کے ہاتھ سے گرتے گرتے بچا۔

"یس ـــ"

"جی سعیدہ گھر پر ہے؟" اس نے پوچھا۔

"جی۔ کون صاحبہ ہیں؟"

"جی میں زارا ہوں"۔

ہیلو ـــ! جیناآپ کو اپنا وعدہ یاد رہا پھر ـــ؟"

"کیسا وعدہ ـــ؟" وہ چمک کر بولی۔

"تاوان بھرنے کا!"

"جی کیسا تاوان ـــ آپ کون ہیں؟"

اب دوسری طرف سے قہقہہ بلند ہوا ـــ بھرپور قہقہہ، طیارے کی گھن گرج لیے۔

"یعنی آپ مجھے یقین دلانا چاہتی ہیں کہ آپ نے مجھے پہچانا نہیں"۔

قہقہہ ٹھوکرے لیتا ہوا لینڈ کر گیا۔

"اچھا زبیر صاحب ہیں ـــ!"

"جی ہاں زارا صاحبہ! اور دیکھیے آپ کے پرس میں آپ کی ایک ذاتی شے نہیں ہے؟ وہ میرے پاس امانت رکھی ہے۔ لیجائیے گا کسی روز"۔

"کون سی چیز ہے"۔

"اب دیکھیے مالِ غنیمت کی فہرست تو دشمن کو نہیں دکھائی جا سکتی نا؟"

وہ روہانسی ہوگئی۔ دُور سے ابا کے ہارن کی آواز آرہی تھی۔
"کم بخت اتنی دیر تک تو آئے نہیں اور اب آگئے ہیں جب ـــــ"
"آپ آئیں گی تو مل جائے گی البتہ اتنے دنوں سے میں استعمال کر رہا ہوں۔"
"بتادیجیے نا آپ؟"
"بتادوں گا لیکن آنے پر۔"
"میں نہیں آسکتی۔"
دوسری جانب سے قہقہہ پھر اڑنے لگا:
"معاف کیجیے گا آپ کا باپ بھی آ رہے گا۔"
اس نے جلدی سے فون چونگے پر دھر دیا۔
واقعی اس کا باپ پورچ تک آچکا تھا۔
رات بہت جا چکی تھی۔
اس نے سر اٹھا کر دیکھا غسلخانے میں زیرو کا بلب روشن تھا اور اس کی روشنی درز میں سے اندر آرہی تھی۔ شبانہ کی ایک چوٹی تکیے پر سانپ کی طرح پڑی تھی اور اس کا سر اندر رضائی میں غائب تھا۔
وہ کہنی کے بل ہوگئی۔ اسے زبیر پر کتنا غصّہ آرہا تھا۔ اگر اس وقت وہ سامنے ہوتا تو زارا اپنے پورے ہاتھ کا تھپڑ اس کے منہ پہ مارتی لیکن اس کے جی نے پوچھا:
"زارا بی بی! تم نے یہ چانٹا اس وقت کیوں نہ رسید کیا جب . . . ."
لیکن تب تو وہ دونوں اکیلے تھے اور ان سے بیس فٹ کے فاصلے پر سعیدہ فرائنگ پین میں کباب تل رہی تھی۔ آملیٹ اور اور کبابوں کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ زبیر اس کی کرسی پر دونوں ہاتھ رکھے آگے کو جھکا ہوا تھا۔ ساری طرف اندھیرا تھا اور ہری لان میں سے سردی اوپر کی طرف اٹھ رہی تھی۔ پام کے گملے یوں نظر آرہے تھے جیسے چھوٹے چھوٹے بچے دم سادھے

سیڑھیوں پر بیٹھے ہوں اور ان بچوں کی آڑ میں وہ کرسی پر نیچے کی طرف جھکتی جا رہی تھی۔

"دیکھو زارا! دائیں اور بائیں جانب ایک ایک الوداعی بوسہ ـــ اور بس!"

"ارے نیک بخت! تجھے چومنا ہی ہے تو خود چوم لے"۔ اس نے جی میں کہا ـــ لیکن وہ جھکا آ رہا تھا اور بیس فٹ کے فاصلے پر سعیدہ باورچی خانے میں کباب تل رہی تھی۔ وہی کباب جو سینما سے واپسی پر وہ لائے تھے۔

زبیر کی راجپوتی مونچھیں اس کے بہت قریب ہو گئیں:

"مجھے چوم لو ورنہ پچھتاؤ گی ـــ بہت"۔

زارا نے جلدی سے اس کے گالوں کو دونوں طرف چوم لیا اور دھکا دیتی ہوئی کھڑی ہو گئی جیسے کوئی بلا ٹالی ہو۔ اس طریقے سے استقبال کے وقت اطالوی لوگ ایک دوسرے کو چومتے ہیں ـــ لیکن اب رات کے اندھیرے میں جب اس واقعہ کو چار گھنٹے ہو چکے تھے اسے اپنی اس حرکت پر غصہ آ رہا تھا۔ کبھی وہ سونے والی گولیاں ابا کے کمرے میں سے چرا کر لانے کے متعلق سوچتی، کبھی سوچتی کہ تیسری منزل سے کود جاؤں اور اس جھگڑے سے نجات پاؤں جس میں خواہ مخواہ مجھے محبت کرنے پر مجبور کیا جا رہا ہے ـــ خواہ مخواہ ہاں۔

ابھی چند دن ہوئے جب وہ سعیدہ کے ہاں گئی تھی تو زبیر نے اسے سر دبانے پر مجبور کر دیا تھا ـــ کوئی کھیل ہے ـــ کوئی مذاق ہے ہاں! وہ چوری چوری اٹھی اور کاغذ پنسل اٹھا کر غسلخانے کی طرف چل دی۔ زرّیں نے ایک کروٹ لی اور غسلخانے کی طرف پیٹھ موڑ لی۔ اندر سفید کموڈ کا ڈھکنا بند کر کے وہ ڈھکنے پر بیٹھ گئی۔ کتنا غیر رومانی انداز تھا پہلا عشقیہ خط لکھنے کا ـــ کس قدر اَن رومانٹک!

اس نے سفید سنک کے اوپر لگے ہوئے شیشے میں جھانکا۔ وہ اس وقت چڑی ہوئی بلی لگ رہی تھی۔ جلدی جلدی اس نے خط لکھنا شروع کیا۔ آدھ گھنٹہ گزر گیا۔ کئی صفحے بھر گئے۔ یہ خط اس نے پھاڑا لیکن سارے غسلخانے میں ایسی کوئی جگہ نظر نہ آئی جس میں وہ

یہ ٹکڑے پھینک سکتی۔ اس نے یہ ٹکڑے کھڑکی کھول کر باہر پھینک دیے۔ دوسرے لمحے اسے یہ اندیشہ لاحق ہو گیا کہ اگر کسی نے صبح یہ پُرزے اٹھا لیے تو؟

لیکن اب تو کاغذ کے ٹکڑے باہر تھے اور آہستہ آہستہ ہوا بھی چل رہی تھی۔ وہ دوبارہ کموڈ پر بیٹھ گئی اور اس بار سہ حرفی خط لکھ کر لفافہ میں بند کر دیا۔

سنیے زبیر صاحب!

آپ خدا جانے اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہیں۔ بہتری اسی میں ہے کہ آیندہ آپ مجھ سے کسی قسم کا تعلق نہ رکھیں ورنہ میں ابا سے آپ کی شکایت کر دوں گی۔

"زارا"

اس کے خط کا کوئی جواب نہ آیا۔

عصمت اسی طرح پلیٹ فارم پر جاتی تھی۔ اور کوارٹرلی امتحان میں فیل ہو چکی تھی۔ اس کے چہرے پر عجیب سی زردی چھائی رہتی۔ کئی راتوں کی بے خوابی نے سارا لہو چوس لیا تھا۔ اب اسے کئی بار دو دو گھنٹے پُل پر کھڑا رہنا پڑتا لیکن مختار نہ آتا۔

زارا اسے سمجھاتی کہ "ہوش کے ناخن لے۔ جو دولہا پہلے ایسے نخرے دکھا رہا ہے وہ بھلا بعد میں کب جینے دے گا۔ ساری عمر تیری طرف پیٹھ کر کے سوئے گا اور تُو اس کی پیٹھ سے لگی اپنے مقدر کو روتی رہے گی"۔

اور جب یہ مشورہ دے کر وہ کالج سے لوٹتی تو نادانستہ طور پر اس کے قدم پوسٹ بکس کے قریب آہستہ ہو کر رک جاتے۔ وہ لکڑی کا پٹ کھول کر دیکھتی۔ ننھی سی مردار چھپکلی اپنے کر ڈبے کی چھت سے لگ جاتی اور بس! ۔۔۔ پھر آہستہ آہستہ برآمدے تک آتی ۔۔۔ سیڑھیوں پر کتابیں رکھ کر وہ اور ستون کے موکھے کی طرف دیکھتی ۔۔۔ "کیا گھر بسا لیا ہے چڑے اور چڑیا نے"۔

چڑے میاں اب بھی اِترا تے اور چڑیا کو بچوں کی تربیت کے سو سو اصول سمجھاتے۔ لیکن ـــــ لیکن خط نہیں آتا رسالپور سے۔ آخر کیوں؟

اس کے چہرے پر بھی زردی نے دھاوا بول دیا تھا اور ابا اسے ٹیکے لگوانے لگے تھے۔ کوئی کہتا لہو کی کمی پیدا ہو گئی ہے۔ کوئی کہتا پڑھتی زیادہ ہے۔ اماں نے اسے شبانہ اور زرّیں کے کمرے سے نکال کر لائبریری کے ساتھ والا کمرہ عطا کر دیا تھا ـــــ لیکن وہ سوچتی رہتی کہ آخر خط کیوں نہیں آتا۔ کیا ایسا ہی بے وفا نکلا یا صرف فلرٹ کر رہا تھا، فلرٹ۔

ہولے ہولے تکیے بھیگتے۔ رومال بھیگتے اور وہ بے خوابی کے مارے اِدھر سے اُدھر کروٹیں بدلتی رہ جاتی۔

"کون؟"

"سعیدہ ہوں زارا"۔

"کہو کیا حال ہے؟"

"زارا! میں آج کالج نہیں جاؤں گی، بھائی زبیر آئے ہیں"۔

"کون؟" حالانکہ اس کے اگ انگ نے یہ نام سُن لیا تھا۔

"ہائے اللہ آہستہ بولو ـــــ کوئی ٹرنک کال ہے کیا۔ بھائی زبیر آئے ہیں" ـــــ سعیدہ دوسری طرف سے بولی: "میں کالج نہیں جاؤں گی۔ اپنی طرف سے میری درخواست دے دینا"۔

"اچھا"۔

پھر وہ بھی کالج نہ گئی۔

سارا دن ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر پڑھتی رہی۔ اماں نے اسے کھانے کے لیے بُلایا۔ لیکن وہ نہ گئی۔ چڑیوں کا جوڑا اندر سے نظر آتا تھا اور فون کا چونگا دو قدم دُور تھا۔ سارا دن فون نہ آیا اور رات کو وہ بلا مقصد سعیدہ سے ملنے چلی گئی۔

گرم نیلی وردی میں سیاہ بوٹ پہنے وہ چھوٹے سے قد کا سانولا ..... نیولا سا آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی شکل کتنی معمولی تھی۔ اس معمولی صورت پر تیکھی تیکھی راجپوتی مونچھیں بڑی سنجیدہ لگ رہی تھیں اور دائیں ہاتھ پر زیادہ سگریٹ نوشی سے گہرے زرد دھبے پڑے ہوئے تھے جو سانولے ہاتھ پر اور بھی بدنما لگتے تھے۔

زبیر نے اسے دیکھ کر چہرہ نہ اٹھایا۔

"ارے زبیر بھائی! جینا آئی ہے" سعیدہ نے اسے متوجہ کیا۔

"کون جینا؟" اس نے اخبار سے یوں لاپرواہی سے سر اٹھایا گویا سامنے اردلی کھڑا ہو۔

"ہائے زارا ــــ بھائی" سعیدہ بولی۔

"ہیلو ــــ کیا حال ہے آپ کا"

"ٹھیک ہوں جی" وہ منمنائی۔

لمحہ بھر کو اس نے زارا کی طرف دیکھا اور پھر سگریٹ پینے میں مصروف ہو گیا۔ اس کی بہنیں زرّیں اور شبانہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ باہر گراؤنڈ میں کھیل رہی تھیں۔ اندر شام کا جھٹپٹا تھا۔ ریڈیو گرام، ایرانی قالین، چینی کے چھوٹے چھوٹے مجسمے، بلّوریں پھولدان، سب اندھیرے میں ڈوبے تھے۔ ٹرالی پر چائے کے باسی برتن اب بے نور تھے۔ صرف چاندی کی کیتلی، دودھ دان اور چینی دان اس مدھم سی روشنی میں بھی پارے کی طرح دمک رہے تھے۔ وہ اسی طرح اخبار پڑھے جا رہا تھا۔ اس نے ایک دفعہ بھی سر اٹھا کر نہ دیکھا اور زارا کو آئے پورے دو گھنٹے ہو چکے تھے۔

بڑی دیر کے بعد زارا نے آہستہ سے کہا:

"بتی جلا دوں؟"

"جلا لیجیے اگر آپ کو ضرورت ہو" جواب ملا۔

زارا نے بتی نہ جلائی۔

سعیدہ اپنے کمرے میں نماز پڑھنے گئی ہوئی تھی۔ اگر وہ چاہتی تو وہ بھی نماز پڑھنے جا سکتی تھی لیکن ـــــ خدا جانے وہ کیوں نہ گئی۔

پھر اس نے خود ہی پوچھا:

"آپ کو میرا خط مل گیا تھا؟"

"جی ـــــ آپ کا خط؛ شیوڈر مل گیا تھا۔ بھلا رسالپور میں مجھے کون نہیں جانتا؟ شیطان کی طرح مشہور ہوں صاحب!"

وہ پھر اخبار کے پیچھے غائب ہو گیا۔

اخبار نہ ہوا موٹی ڈھال ہو گئی لڑائی کی۔

"اور آپ نے جواب نہیں دیا؟"

اس بار راجپوتی مونچھیں ذرا جنبش میں آئیں اور مسکراہٹ بن کر لبوں پر پھیل گئیں:

"آپ نے خود ہی لاتعلقی کا آرڈر دیا تھا ورنہ ہم بیچلروں کے لیے تو خط لکھنا بہترین پاس ٹائم ہے۔"

"پاس ٹائم؟" وہ اٹھ بیٹھی۔

زبیر پھر اخبار پڑھنے میں معروف ہو گیا۔

"آپ مجھے سمجھتے کیا ہیں؟"

بڑی سادگی سے زبیر بولا۔ "جینا لولو برجیڈا۔"

"بہت خوب۔ سمجھتے رہیے۔"

وہ اٹھ کر چلی گئی لیکن زبیر نے اخبار پر سے نگاہ اٹھا کر بھی اس کی طرف نہ دیکھا۔

عصمت کے چہرے پر اتنے سارے آنسوؤں کے دھبے تھے، بالکل جیسے اس کے روشندان پر مٹی اور بارش کے چھینٹوں سے نقشے بنے ہوئے تھے۔ اب آنسو خشک ہو چکے

تھے اور اس کی رندھی ہوئی آواز بھی نارمل ہو گئی تھی لیکن چہرے پر بڑے کرب کی کیفیت تھی۔
وہ کہتی گئی:

"میں نے مختار کے لیے کیا نہیں کیا زارا۔ اماں کی مار کھائی۔ ابا نے گولی مارنے کی دھمکی دی لیکن میں باز نہیں آئی۔ جب کبھی مجھے موقع ملا میں اسے ملنے گئی ــــ اور میں ہی بے غیرت تھی کہ ــــ کہ میں نے خود ہی اس سے کہا، مختار! اگر تم چاہو تو ــــ تو ہم دونوں کراچی چل دیں۔ یہاں سے، پلیٹ فارم سے چپکے سے روانہ ہو جائیں اور کسی کو ہمارا علم نہ ہوگا لیکن اسے میری پرواہ ہی کب تھی ــــ"

پھر ایک سسکی اس کے سینے کو چاٹتی نکلی ــــ کسی دھول بھری ویران راہ پر ہوا کا جھونکا۔

"میں نے مختار کی محبت میں ــــ ہائے ــــ اور کہنے لگا عاقل سے بیاہ کر لو۔ اسی میں ہماری بہتری ہے۔ خدا نے چاہا تو شادی کے بعد میں تم سے ملتا رہوں گا ــــ ذرا تم سوچو تو ــــ ہائے اللہ ــــ"

زارا نے تھرڈ ایئر کی کتابیں لان پر پٹک دیں اور عصمت کے چہرے سے اس کے ہاتھ اتارتے ہوئے کہا:

"چلو اچھا ہی ہوا ہے کہ ایسا بد بخت تمہارے پیچھے سے ہٹ گیا۔ ایسے شوہر سے بھلا کیا سکھ ملتا؟"

"میں تو روتی ہوں کہ ــــ کہ ایسے آدمی کے لیے کتنی بے غیرت بنی ــــ توبہ!"

پہلے آنسوؤں کا دھارا تیزی سے بہا پھر سسکیوں کی شکل اختیار کی اور آخر میں بند بند ہچکیاں سی رہ گئیں۔

زارا نے فیصلہ کر لیا کہ اب زبیر کی صورت بھی نہ دیکھے گی۔

چڑیا کا ایک گنجا سا نازک بچہ فرش پر گر گیا تھا اور وہ اس کے اردگرد منڈلا رہی تھی۔

زارا نے اس بچے کو اپنی ہتھیلی پر اٹھایا تو اسے عجب گدگدی سی محسوس ہوئی۔ بچہ فوراً اس کے ہاتھ سے نیچے گر گیا۔ گھونسلے میں سے چار گنجے بچوں نے گردنیں نکالیں اور بڑی فراغت سے چوں چوں کرنے لگے۔ چڑیا اور چڑا اس تیزی سے نیچے کی طرف اترے کہ عین درمیان میں پہنچ کر ایک دوسرے سے بھڑے اور دور دور جا گرے۔ اب دق کے مریض سے مشابہ بچے کو اس نے پھر اپنے ہاتھ میں اٹھایا اور میز پر چڑھ گئی۔ میز کے اوپر بازوؤں والی کرسی دھری۔ اسے دونوں طرف سے زریں اور شبانہ نے پکڑ رکھا تھا۔ وہ پیر تولتی اوپر چڑھی اور بچہ گھونسلے میں دھر کر اترنے لگی تو چڑیا اس کے کندھے پر آ بیٹھی جیسے اس کا شکریہ ادا کر رہی ہو ـــــ اندر فون کی گھنٹی متواتر بج رہی تھی۔ زریں فون اٹھانے کے لیے چلی تو وہ کرسی سے کود کر بولی:

"ٹھہرو! میرا فون ہے۔"

"ہیلو ـــــ!"

"جی میں ـــــ"

"ہیلو میں زبیر ہوں!"

"کب آئے آپ؟"

"زبیر اور موت کا کچھ پتہ نہیں۔ جب چاہیں آ سکتے ہیں۔"

"اور خیریت ہے؟"

"ٹھیک ہوں ـــــ تم کب ملو گی؟"

"ناممکن ہے ـــــ یہاں سے کالج اور کالج سے گھر۔" وہ آہستہ سے بولی۔

"تین بجے کالج کے گیٹ پر میری موٹر سائیکل ہو گی۔"

"ناممکن ہے۔ میرے ساتھ سعیدہ بھی باہر نکلتی ہے۔" اس کی نظریں باہر جمی تھیں۔ جہاں اس کی بہنیں کرسی پر چڑھی گھونسلہ دیکھ رہی تھیں۔

"تم پندرہ منٹ پہلے باہر نکلنا — بس!"

"سنیئے تو —"

"میں کچھ نہیں سن سکتا۔" آواز آئی۔

"ذرا —"

اُدھر سے فون بند ہو گیا۔

زارا کو محسوس ہوا وہ اپنے گھونسلے سے نیچے گر گئی ہے اور اس کے ابا اور امی اِدھر اُدھر پریشان ڈول رہے ہیں۔

موٹر سائیکل کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ کر اسے محسوس ہوا وہ ہوا کے دوش پر اڑ رہی ہے۔ اپنا با غیرت حصہ وہ پھاٹک پر ہی چھوڑ آئی تھی اور اب اس کا دایاں گال کھردری وردی کی چبھن محسوس کر رہا تھا۔ وہ نہر کی سڑک کے ساتھ بڑی رفتار سے رواں ہوئے۔

جاتی سردیوں کی خنکی فضا میں اتر رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کو نہر کا پانی ٹھنڈا محسوس ہو رہا تھا۔ آگے چل کر زبیر نے موٹر سائیکل اچانک روک لی اور آگے بڑھ کر اسے اتار لیا۔ سڑک سنسان تھی لیکن زارا کا جی ڈر رہا تھا۔

"یہاں کیوں رک گئے ہیں آپ؟"

"ذرا ٹہلیں گے۔"

"آپ نے تو وعدہ کیا تھا کہ اپنے گھر لے چلیں گے۔"

"ایسے وعدے فضول ہوتے ہیں۔ تمہیں اب تک سمجھنا چاہیے تھا۔"

"لیکن اگر ادھر سے میرے ابا گزرے تو؟"

"تو وہ کل ہماری شادی کر دینے پر اصرار کریں گے۔"

زارا کا چہرہ تمتما اٹھا۔

"میری تو منگنی ہو چکی ہے۔" زارا نے آہستہ سے جھوٹ بولا۔

"پھر تو اور بھی اچھا ہے۔ شوہر سے محبت بھی کیسے ہو سکتی ہے؟ خانگی فضا میں تو رومان کا دم گھٹ جاتا ہے۔"

اب زارا کو غصہ آ گیا۔ وہ موٹر سائیکل کی طرف پلٹتے ہوئے بولی:

"مجھے کالج تک چھوڑ آیئے۔"

"پلیز۔"

بڑے مؤدبانہ انداز میں جھک کر اس نے سیلوٹ کیا اور پھر سامنے والی سیٹ پر آ بیٹھا۔ ایک جانب چھوٹے چھوٹے پودے نہر کا پانی اور سبز گھاس کی پٹڑی تیزی سے پیچھے کی طرف بھاگنے لگیں۔

جب وہ ہوٹل تک پہنچے تو ان کی پھر صلح ہو چکی تھی۔

زبیر نے کمرے کے تالے کو کھولا اور ایک طرف کھڑا ہو گیا۔

زارا کا دل یک لخت زور سے اچھلا۔ اُسے کسی نے کنوئیں میں چھلانگ لگانے کو کہا تھا۔ پھر وہ آگے بڑھ گئی۔ اس کی آنکھوں میں زرین اور شبانہ کی شکلیں گھومیں۔ ان کی ابھی شادیاں ہونا تھیں۔ اگر — اگر —؟

تو پھر ان سے شادی کون کرے گا؟

اماں کے ماتھے پر کلنک کا یہ بڑا سا ٹیکہ لگ جائے گا۔

اس کے بہن بھائی بڑی فراغت سے گھونسلے میں چوں چوں کرنے لگے اور —

ہوٹل کے کمرے میں غلاظت اور باسی پن کی باس۔ سامنے وارڈروب کے دونوں پٹ کھلے تھے اور اوپر کے تختے پر سے اخبار کا کاغذ لٹک رہا تھا۔ ڈریسنگ ٹیبل پر کسی عورت کے بالوں کی پنیں پڑی تھیں۔ زارا نے آگے بڑھ کر یہ پنیں دراز میں بند کر دیں اور کھڑکی کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

پیچھے بڑی احتیاط سے زبیر نے دروازہ بند کیا اور پھر چابی قفل میں گھومی —

زارا نے لپک کر بھاگ جانا چاہا۔ اس نے جی میں سوچا کہ بھلا میں نے سٹیشن پر جانے کی کیوں نہ سوچی ۔ ہم بھی وہاں لائنوں پر آتی جاتی ٹرینوں کو دیکھتے اور پھر سٹیشن سے باہر نکل کر وہ پلیٹ فارم کا ٹکٹ پھاڑتی اور گھر واپس آجاتی عصمت کی طرح ۔ وہاں سے بھاگنے کی راہ تو ہوتی۔ بڑی دلیری سے اس نے کہا:

"یہ جگہ اچھی نہیں ۔ اور امی واہ دیکھ رہی ہوں گی"۔

زبیر نے اپنی ٹوپی ڈریسنگ ٹیبل پر رکھ دی اور اس کے قریب آ گیا۔

وہ دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔

زبیر کے بالوں بھرے بازو آگے بڑھے اور اس نے زارا کو اپنی گرفت میں لے لیا۔

"چھوڑیئے زبیر صاحب ۔"

"ڈرتی ہو"۔

"مجھے گھر لے چلیے ۔ پلیز زبیر! مجھے گھر لے چلیے"۔

"یہ تمہیں پہلے سوچنا چاہیے تھا"۔

"میں آپ کو شریف آدمی سمجھتی تھی"۔

اب زبیر کا منہ اس کے جسم کو جگہ بے جگہ چوم رہا تھا۔

"میں شریف آدمی ہوں"۔

"بس آپ مجھے گھر لے چلیے"۔

"کیوں ۔"

"میری منگنی ہو چکی ہے زبیر صاحب!"

"منگنی ہو چکی ہے تو پھر بھی میں تمہیں حاصل کروں گا ۔ چاہے ایک گھنٹے کے لیے ہی کیوں نہ ہو"۔

پورے ہاتھ کا تھپڑ اس نے زبیر کے منہ پر مارا۔ اور اسی لمحے اسے احساس ہوا کہ یہی اس کی غلطی تھی۔ زبیر جیسے آدمی کو غصہ دلانا بڑی حماقت تھی ـــــ وہ بپھرے ہوئے شیر کی مانند اس کی طرف لپک کر آیا اور ایک ہی ریلے میں اسے بہا کر لے گیا۔

وہ پلنگ پر اوندھی لیٹی تھی اور اس کے رخساروں پر آنسوؤں کا بادل سا چھایا رہا

"سنو ـــ سنو زارا! ـــ میں تم سے شادی کروں گا ـــ میں اور تم اکٹھے رہیں گے ـــ!"

گھونسلے سے گری ہوئی چڑیا چلائی ـــــ "اب تو مجھے گھر چھوڑ آیئے"۔

آنسو اس کے حلق میں گر رہے تھے اور زارا کو اس وقت خدا جانے کیوں وہ پنیں یاد آ رہی تھیں جو دراز میں پڑی تھیں۔ خدا جانے وہ عورت کتنی جلدی میں یہاں سے بھاگی ہو گی کہ پنیں اٹھانی یاد نہیں ہوں گی؟

جانے وہ اپنی تباہی سے بھی بچی کہ نہیں؟

اسے کالج گئے ہوئے پورے دو ہفتے ہو چکے تھے۔ اماں پوچھ کر ہار گئیں لیکن اس نے بس ایک ہی جواب دیا:

"اماں! میں اب نہیں پڑھوں گی ـــ بس!"

زبیر نے کئی مرتبہ فون کیا لیکن ہر بار وہ چونگا نیچے دھر دیتی۔ اس کے جی میں اپنی بے غیرتی کے خلاف اتنے سمندر موجزن تھے کہ سارا سارا دن بستر میں لیٹی طوفان بہایا کرتی۔ پھر دو بار زبیر سعیدہ کو لے کر ان کے گھر آیا لیکن اس نے سعیدہ سے بات تک نہ کی اور جب چڑیا اپنے بچوں کو اڑانیں بھرنے کی ترکیبیں سکھا رہی تھی تب اس کی منگنی ہو گئی۔

پہلے تو پون گھنٹہ فون کی گھنٹی بجتی رہی.....

زریں اور شبانہ سکول جا چکی تھیں اور اماں باورچی خانے میں تھیں ۔۔۔ پھر اس نے فون اٹھا کر نیچے دھر دیا اور دیوان پر لیٹی رہی ۔ وہ سوچ رہی تھی کہ عصمت قاتل کے ساتھ اب تو خوش ہوگی نا؟ ۔۔۔ اس مسرت میں بھلا کون سی چیز مانع ہو سکتی ہے ؛ ۔۔۔ کم از کم اس کا ضمیر تو اسے دن رات ملامت نہ کرتا ہوگا ؛ اتنا عرصہ گزر جانے کے باوجود ابھی بھی اس کی نظروں میں ہوٹل کا کمرہ، وارڈروب میں سے لٹکتا ہوا اخبار اور دراز میں بند لمبی لمبی پنیں گھوم رہی تھیں۔

خدا جانے زبیر کہاں تھا؟

وہ کتنی جلدی قریب آئے ۔ سالوں کی منزلیں لمحوں میں گزاریں اور پھر سیاروں کی طرح بچھڑ گئے کبھی اس جدائی کا قلق اسے پچھتاوا بن کر ڈستا اور کبھی وہ مکمل طور پہ انتقام کا جذبہ بن کر شمع سی جلنے لگتی۔ کم از کم ایک بار زبیر اس کے ابا سے شادی کی درخواست کر سکتا تھا۔ کم از کم وہ چھوٹی سی کوشش کسی مثبت رنگ کی کرتا تو شاید وہ اسے معاف بھی کر دیتی لیکن دکھ تو یہی تھا کہ زبیر نے کبھی بھی اسے اپنی دلہن نہیں سمجھا۔

چھوٹی چھوٹی راجپوتی مونچھیں اور سانولا چہرہ!

"بھلا اسے کس بات پر مان تھا؟"

اماں کمرے میں آئیں اور انھوں نے چونگا پھر واپس دھر دیا۔

"بازار چلو گی زارا؟" اماں نے پوچھا۔

"کیوں امی؟"

"تمھارے بسنتی جوڑے پر کام کروانا ہے اُسے دے آئیں۔"

"آپ چلی جائیں امی۔"

فون کی گھنٹی پھر بجنے لگی۔

باہر ایک چڑیا کا بچہ لمبی سی اڑان بھر کر پھر زمین پر آ رہا۔

اماں نے فون اٹھایا۔

"ہیلو ۔۔۔!"

"جی میں مسز مسعود ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"اچھا سعیدہ ہے ۔۔۔ کیا ۔۔۔ ؟ کیا تمہارا بھائی زبیر احمد ۔۔۔ ؟ نہیں میں نے تو تونہیں دیکھا ۔۔۔"

وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"کیسے ۔۔۔ کیسے بیٹا ۔۔۔ توبہ توبہ ! بخدا دل بیٹھ گیا ۔۔۔ لاش کب آ رہی ہے ؟"

"آج ہی ۔۔۔"

"میں ابھی آؤں گی ۔۔۔ ابھی ۔۔۔"

اس نے اخبار اٹھایا۔

وہی راجپوتی مونچھیں ۔۔۔ وہی مسکراہٹ۔

"بے چارہ مرگیا۔ جہاز بند ہوگیا اور مر گیا ۔۔۔ نجات مل گئی اسے جلتے پتھر دل میں۔"

"خدا جانے کہاں تک دھنس گیا ہوگا ؟"

"کیوں مر گیا زبیر ۔۔۔ کیسے مر گیا اتنا جاندار شخص ؟"

"لوگ کیسے مر جاتے ہیں ۔۔۔ انہیں موت نہیں آتی جو اس کی آس کرتے ہیں اور وہ اتنی بلندیوں سے جا گرتے ہیں جنہیں اپنی بانہہ بل پہ ناز ہوتا ہے ۔۔۔ یہ کیسی انہونی سی بات تھی ۔۔۔ زبیر احمد ڈیڈ ۔۔۔ زبیر احمد"

وہ سعیدہ کے گھر سے لوٹ کر اپنے برآمدے میں بیٹھی تھی۔ اوپر موکھے سے چڑیاں اڑ کر جا چکی تھیں۔ گھونسلہ خالی تھا۔ فون کی گھنٹی خدا جانے اب کس لیے بج رہی تھی۔ اس نے اپنے گھٹنوں پر سر رکھ لیا ۔۔۔ اگر سعیدہ مجھے یہ خط پہلے دے دیتی تو شاید زبیر نہ مرتا ؟ ۔۔۔ اور اگر زبیر نہ مرتا تو شاید زندگی کے کسی موڑ پر میں اسے معاف کر دیتی۔ اس نے اپنا پرس کھولا

اور ایک بوسیدہ خط نکالا ـــــ لکھا تھا:

"زارا! میری جان ـــــ!

تم مجھ سے ناراض ہو۔ تمہیں میری نیت پر شبہ ہے۔ میں تمہیں کیسے یقین دلاؤں کہ میں تمہارا ہوں۔ تم مجھے سمجھ نہیں پائیں ـــــ جینا! ـــــ تم بہت خوبصورت ہو اور میں بچپن سے احساس کمتری کا شکار رہا ہوں۔ میں نے تمہارے گرد ہر طرح کی فصیل کھڑی کرنی چاہی ـــــ جسمانی اور ذہنی کہ تم بھاگ کر کہیں نہ جا سکو لیکن مجھے ان فیصلوں پر اعتماد نہ رہا۔ تم سمجھتی ہو کہ میں نے تمہیں اپنی ہوس کا شکار بنانا چاہا ہے لیکن یہ غلط ہے۔ یہ ایک اور فصیل تھی ـــــ زارا! ایک کمزور آدمی ایک خوبصورت عورت کو جکڑنے کے لیے سب کچھ کرتا ہے۔

یقین جاننا زارا۔ اس ہوٹل والے واقعے سے پہلے میں بھی کنوارا تھا۔ اب میری شادی ہو گئی ہے۔ اگر تم مجھے اجازت دو گی تو میں تمہارے والدین کے قدم چوم کر کہوں گا کہ زارا کو مجھے دیدیں۔ میں انہیں منوا بھی لوں گا لیکن ایک تمہاری اجازت کی ضرورت ہے۔

اگر تم نے اگر تم نے مجھے معاف نہ کیا تو کسی دن فضا میں جہاز لے جاؤں گا۔ اور پھر اس جہاز پر میری لاش اترے گی۔ خدا کرے جب میری لاش اترے تو تمہاری گود میں میرا بچہ کھیلتا ہو ـــــ میں تمہیں اس سے بڑی بددعا نہیں دے سکتا۔

تیرا ـــــ زبیر"

فضا میں ایک سفری جہاز بڑی گھن گرج کے ساتھ گزر گیا۔

زارا نے خط اپنے پرس میں رکھ لیا اور موکھے کی طرف دیکھنے لگی۔

چڑیا کا گھرانا کب کا رخصت ہو چکا تھا اور اب وہاں تنکوں کے سوا کچھ نہ تھا۔

زارا نے گھٹنوں پر سر رکھ لیا اور اپنے جی میں کہا:

"آہ زبیر! کاش میری گود میں تیرا ہی بچہ کھیل سکتا۔ افسوس تو یہی ہے کہ تیری یہ بددعا بھی پوری نہ ہوئی!"

وہ پہلا پتھر جو اس نے عصمت کے مارا تھا، گھوم پھر کر اسی کے ماتھے کو آ لگا تھا۔

خود شناس

دو گلیاں پیچھے امام باڑہ تھا ـــــ لیکن شامِ غریباں کی ملی جلی آوازیں دوسری منزل پر ایسے آ رہی تھیں جیسے برسات میں سیل صحرا گیر زور و شور سے بڑھ رہا ہو ـــــ سسکیاں، آہیں، آنسو شام کی اندھی روشنی میں نہ جانے کس ہوائی پالکی پر سوار چلے آ رہے تھے۔ کچھ دیر پہلے جب حضرت امام حسینؓ کا گھوڑا اس کی گلی کے سامنے سے گزرا اور سیاہ ماتمی لباس میں ملبوس ماتم کناں ساتھ ساتھ امام باڑے کی جانب رخصت ہوئے تو اسے معلوم نہ تھا کہ وہ کیا کرنے والا ہے؟

ابراہیم کو عام طور پر خود اپنے فیصلوں کا علم نہ ہوتا۔ فیصلے اچانک اس پر حملہ آور ہوا کرتے ـــ اتنے امیر کبیر گھرانے سے تعلق رکھنے کے باوصف اسے دوسروں پر زین کسنے کا فن نہ آتا تھا۔ وہ زیادہ گوئی سے پرہیز کرتا، چونکہ وہ چاندی کے چمچے کو منہ میں لے کر پیدا ہوا تھا اور اس دنیا میں آنے سے کسی طور پر بھی شرمندہ نہ تھا۔ اس لیے کسی کا زیر بار ہونا تو الگ بات تھی وہ تو کسی اور میں بھی حسنِ طلب دیکھ کر ہی کپکپا اٹھتا اور ایسے انتظام سے دوسرے کی حاجت پوری کرتا کہ مدد لینے والا احسان کے احساس سے بھی بوجھل نہ ہونے پاتا۔

لیکن اس کے گھرانے کی کچھ اور طرح کی زندگی تھی۔ دادی اماں سے لے کر چھوٹے منّے

یہ لوگ دوسروں کی زندگیوں سے کھیلتے آئے تھے۔ ان کی سات پیڑھیاں اس گلی میں، اس گلی سے منسلک دوسری گلیوں میں بڑی ہمہ گیر قسم کی رشتہ گیریاں کر چکی تھیں۔ ان سب کے سروں پر مور مکٹ تھے۔ یہ لوگ اور ان کی موروثی دھاک کے سامنے محلّے کے تمام باسی موری کے کیڑے تھے۔

آہستہ آہستہ ابراہیم سمجھ گیا تھا کہ مشرق میں خاندان کا تصور کچھ محبت، اخوت اور فریادرسی کے لیے پیدا نہیں ہوا ہوگا بلکہ خاندان محض سانجھی ضرورت کے تحت طاقتور اور سیسہ پلائی دیوار کی طرح بنتے ہوں گے کہ دوسروں کو ان سے سر پھوڑنے کا موقع ملے۔ انفرادی قوّت کی جگہ مجموعی قوّت کے ساتھ ہر سر اٹھانے والے کا مستک توڑا جا سکے۔ اپنے خاندان کی طاقت سے دوسرے خاندانوں کو ملیامیٹ کرنے کی اجازت ہو ـــــ ابھی وہ دسویں میں تھا کہ اسے یہ بھی سمجھ آ گئی تھی کہ مشرق میں خاندان اور خاندانی بنجابت کا سسٹم ہی کا دوسرا نام ہے۔

اس کا باپ ساری زندگی آدرشوں کا شکار رہا۔ اسے غریبوں سے ہمدردی تھی۔ اسے ملک کی حالت سنوارنے کا شوق تھا۔ وہ لوگوں کے لیے کچھ کر گزرنا چاہتا تھا لیکن ہر جگہ اس کی انا سامنے آ کھڑی ہوتی اور حزن و ملال کی کوئی لہر دھکا مار کر اسے گرا سکتی ـــــ اس کا باپ اپنے وجود کے ادراک سے پرے کبھی سوچ نہ سکا تھا۔ اس کی ذات مرکز تھی اور ساری کائنات، معاشرہ، دوسرے لوگ اس کی اپنی ذات کے حوالے سے تھے۔ اگر وہ تنہا تھا تو ہر شے تنہا تھا۔ بوٹے، پتّے، سورج، بارش کا ہر قطرہ تنہا تھا۔ اگر وہ خوش تھا تو قوس قزح سے لے کر گھاس کے سوکھے تنکے تک سب مسرور تھے۔ اتنی خود پرستی کے باوجود اس کا باپ ساری عمر آدرشوں کا شکار رہا ـــــ صرف اسے یہ معلوم نہ ہو سکا کہ تمام آدرش اس نے دوسروں کو اپنے سے کمتر سمجھنے کے لیے بنا رکھے تھے ـــــ آدرشوں کا ہنٹر ہاتھ میں لے کر وہ دوسرے کمزور لوگوں کو ان کی کم عقلی، تھوڑدلی، غریبی، ناداری، نااہلی، ناسمجھی کے الزامات دے مارا

سکتا تھا۔ اس کے باپ نے کئی تحریکیں چلائیں، کئی جلسے کیے، کئی کمیٹیوں کو جنم دیا لیکن وہ ساری عمر یہ نہ جان سکا کہ جو آدمی ذات کے چکر میں محبوس ہو وہ آدرشوں کی پوجا تو کر سکتا ہے لیکن خود اپنا چکر توڑ کر آدرش کا حصہ نہیں بن سکتا۔

اس کی ماں رانی مینا وتی نہیں تھی ــــ

اس کا باپ راجہ گوپی چند بھی نہیں تھا ــــ

راجہ گوپی چند جو بھرتری ہری کا بھانجا بتایا جاتا ہے ــــ بھرتری ہری جو راجہ بکرماجیت کا بڑا بھائی تھا ــــ یہ انا کے چکر سے نکلے ہوئے مہاراجے تھے ــــ ان میں مہاتما بدھ کی روح گھومتی تھی اور وہ دولت کا کرم بھوگ جو غریبی کے چکر سے بھی سخت ہوتا ہے، توڑ کر اپنے آدرش سے ہم کنار ہو گئے تھے۔

جس وقت حضرت امام حسینؓ کا گھوڑا گلی میں سے گزرا، ابراہیم شہر نشین پر ایک ٹانگ دھرے بڑی معمولی نظروں سے نیچے گلی میں دیکھ رہا تھا۔ سونے کے زیورات سے سجا خوبصورت گھوڑا، گھوڑے کی راسیں پکڑے نوجوان، لہو رستے سینے، آنکھوں میں شفا بخشنے والا غم، سب بچے بوڑھے جوان گلی سے گزر رہے تھے۔ اس نے کئی بار یہ جلوس دیکھا تھا لیکن اس میں کبھی شرکت نہ کی تھی۔ گلی کی ماتم کناں آوازیں اس کے کانوں میں رانی مینا وتی کا بین بن کر آ رہی تھیں ــــ رانی مینا وتی جو بوڑھی تھی، جس کی آنکھیں دھندلا گئی تھیں لیکن جب اس نے اپنے بیٹے گوپی چند کو صندل کی چوکی پر بیٹھ کر اشنان کرتے دیکھا تو وہ خوفزدہ ہو گئی اور چلائی:

"اے میرے بیٹے! بات سن!! تیرا حسن دیکھ کر میں دن رات سوچ میں پڑی رہتی ہوں تیرے باپ کا حسن جل کر فنا ہو گیا۔ تو جوگ لے لے بامراد ہو گا ــــ یہ زمانہ یہ عالم خواب ہے جسے جال کی شکل دے دی گئی ہے۔ بیٹا! تو بھی جوگی بن جا ــــ غم فانی ہو جائے گا۔"

ساری حویلی میں ایسا تو ایک شخص بھی نہ تھا جو ابراہیم کو جوگ لینے دیتا لیکن اس کے اندر ــــ کہیں بہت اندر اپنی ذات سے چھٹکارا پانے کی خواہش جنم لے رہی تھی۔ وہ بھی